SHNAKHAT E(ISSN) 2709-7641, P(ISSN) 2709-7633
Vol:3, ISSUE:3 (2024) PAGE NO: 164-183
Publishers: Nobel Institute for New Generation
http://shnakhat.com/index.php/shnakhat/index

Cite us here: Saira Bano, Zee Hasham Haider, Dr. Muhammad Shakil Pitafi, & Rafia Malik Assistant. (2024). بانو قدسیہ کے افسانوں میں جدید تکنیکی تجربات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ(افسانوی جزئیات و منظر نگاری اور پلاٹ میں جدت طرز). *Shnakhat*, 3(3). Retrieved from https://shnakhat.com/index.php/shnakhat/article/view/338

"بانو قدسیہ کے افسانوں میں جدید تکنیکی تجربات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

(افسانوی جزئیات و منظر نگاری اور پلاٹ میں جدت طرز)"

Saira Bano[1] Zee Hasham Haider[2]
Dr. Muhammad Shakil Pitafi[3] Rafia Malik[4]

PhD Scholar, Department of Urdu, NCBA&E Sub-Campus Multan at- Sb2036693@gmail.com
PhD Scholar, Department of Urdu, NCBA&E Sub-Campus Multan at- Zeehashamhaider1@gmail.com
Professor, Department of Urdu, NCBA&E Sub-Campus, Multan at- Shakilpitafi@gmail.com
Assistant Professor, Department of Urdu, NCBA&E Sub-Campus, Multan

Abstract

Bano Qudsia 1928-2017 is a big name in Urdu literature as a female writer who wrote numerous fictions in Urdu literature. In her stories, Urdu fiction is unparalleled in recording the impressions of individuality with its unique innovation, technique and style. Bano apa,s each fiction has a layering of styles as well as special technical skills. In this article, it is fully reviewed that technique is the content of the fiction is adapted in to a frame. Accordingly, Bano Qudsia,s while studying the legends carefully , this ,its has been seen that all fictions are associated with a certain skill in their writing. It is an important fact that the narrative technique of Bano qudsia also appears to be present in the fictions of traditional fiction writers, along with all her fictions. In internal self-talk, thought and free search, cry of consciousness, letter, flash back technique provides a way for the reader,s thoughts in reaching the innermost part of the story. But from the overall review, this aspect is prominent that the technique that stands out more than other storytellers in her fictions is her scientific awareness, use of modern theories and modern techniques. Narrative technique, Bano appa summarizes any idea, event or events in suitable words and sentences and presents the events sequentially, in which the importance of proper thought and thought is indispensable. Reportage, the Cry of consciousness, in dependent thinking, internal self-talk, flashback or scientific terms have been used very well in this article. A comprehensive analytical study has been presented on it. Undoubtedly, Bano qudsia is a prominent figure among the eminent writers of the 21st century due to her artistic abilities.

Key words: Numerous fictions, Unparalleled, individuality, innovation, Technique, layering, legends, adapted, traditional, self-talk, Innermost, prominent, awareness, sequentially, Reportage comprehensive, analytical.

قصے اور کہانی کی بہترین شکل جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے زیر اثر دور کی افسانہ نگاری ہے جس کا ہر روپ نہ صرف انسانوں کی جذباتی حس اور فکری پرداخت پر اثرانداز ہوتا ہے۔ اور اپنے انہی اثرات سے موجود حال کے ہر گوشے کو متاثر کرتا ہے۔ بلکہ وہ احساس، ادراک کی انگلی تھامے کہانی کو حالت جبر سے نکال کر زندگی کی تشکیل نو بھی کرتا ہے اس لیے فکشن میں تحریری جمود میں ہلچل کے ذریعے یہ صنف اہمیت کی حامل ہے۔

،،وہی مختصر افسانہ کامیاب افسانہ کہلائے گا، جو قاری کے دل میں خوشی
، غم یا خوف کے جذبات پیدا کر سکے یا اس کے جذبات میں تلاطم پیدا کر سکے۔،،

اعلیٰ تر تخلیق بلکہ ،،احسن تقویم،، سے سرفراز انسان منفرد صفات و خصوصیات سے مزین ہے۔ جس کا کرہ ارض پر مدمقابل نہیں ہے۔ لامتناہی خاصتیوں کا حامل انسان بہ معنی اور باشعور زبان اور الفاظ کا مکمل اختیار رکھتا ہے۔ انسان اپنی یہی مقررہ صلاحیتیں استعمال کرتے ہوئے اپنے احساسات، جذبات اور مشاہدات کو الفاظ کے قالب میں ڈھالنے کا ماہر ہے۔ یہ احساسات، جذبات،، مشاہدات اعلیٰ اذہان کی ترجمانی ہیں، ادب موثر اور موزوں الفاظ کی وساطت سے اپنا مافی الضمیر قارئین حیات تک پہنچانے کی سرگرمی ہے۔

،،ادب کی ایسی صنف جس کی کیفیت اس کے نام سے ظاہر ہے، کہانی کی حیثیت
سے یہ افراد کی جسمانی یا ذہنی سرگرمی سے متعلق واقعات کے سلسلے یا ایک ہی واقعہ
کو بیان کرتی ہے۔ چنانچہ افسانوی ادب کی طرح یہ بھی نقش گری کرتی ہے۔ جس کی
کامیابی اور موضوع کی نقاشی کے مابین فوری رابطے پر منحصر ہے تاہم مختصر
افسانے کی حیثیت سے یہ تاثر کی فوری ترسیل ناول کے عمومی وسائل، بہت رسان اور
سہولت کے ساتھ،، کردار نگاری،، منظر نگاری،، جزئیات نگاری کی سہولت کے ساتھ
ساتھ کرتی ہے، بلکہ آئینہ صفت برق رفتاری کے ساتھ مکمل نقش اجاگر کرتے ہوئے
ممکن بناتا ہے۔،،1

کہانی کار اپنے حقیقی تجربات اور تکنیکی واردات کو سادگی اور تفصیل سے زیر بحث لاتا تھا مگر بعد ازاں قاری کے تخیل، شعور اور ذوق سلیم کے بارے میں حسن ظن کا پیمانہ کارگر ثابت ہوا چنانچہ مختصر افسانے کا ایجاز و اختصار اسی حسن ظن کی بنیاد اور شہادت بن گیا۔

عظیم افسانہ نگار چیخوف نے کہا تھا:

،،اگر مختصر افسانے میں کسی دیوار پر لٹکی بندوق کا ذکر
ہو تو اس بندوق کو افسانے میں ہی چل جانا چاہیے۔،،2

افسانہ نگاری کی یہ منفرد خاصیت ہے کہ وہ افراد، اشیاء، صورتحال کو مخصوص طرز فکر سے جانچتا ہے اور پھر اظہار بیان کی تلوار سے ہر غیر ضروری لفظ، واقعہ، مکالمہ اور ہر زائد کردار کی تراش خراش سے نوک پلک سنوارتا ہے۔

اسی حوالے سے آرتھ سی دانتو لکھتا ہے:

،، کہانی کہنے کے لئے بعض واقعات کو خارج کرنا پڑتا ہے۔

کہانیوں کو کہانیاں بننے کی خاطر بہر طور چیزیں ترک کرنا ہوتی ہیں۔،،3

منظر نگاری اور جزئیات نگاری افسانے کی معنویت واہمیت بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ کیونکہ یہ اہم پہلو ہے کہ منظر نگاری جزئیات نگاری کے باعث معنی وسعت اور مفاہیم کی پرتیں اپنے اصلی مرکز تک ہی نہیں پہنچتی بلکہ مزید پرتیں کھلتی ہیں۔ جیسے ایک ڈرامہ نویس، فلم ساز واقعات میں زندگی ڈالنے کے لیے منظر نگاری اور تصویر کشی جزئیات نگاری کا حربہ لازمی سمجھتا ہے۔ اسی طرح ایک افسانہ نگار کسی شہر اور گاوں، صحرا، دریا اور سمندر، کھیت کھلیان بلکہ کائنات کے نظام کی تمام پرتیں جزئیات کے ساتھ ابھارتا ہے۔ یہ باریکی اور پیچیدگی اس کے بیان میں نہ صرف مددگار ہوتی ہے بلکہ کہانی کے بین السطور پہلوؤں کو سامنے لانے کا باعث بھی ہے۔ اور یہ سب وہ اپنے الفاظ، تشبہات واستعارات کے توسط سے ہی کر پاتا ہے۔ جسے ہم منظر نگاری قرار دیتے ہیں۔ منظر نگاری جس قدر بہترین ہو گی قاری کی دلچسپی وتسکین کا باعث بھی ہو گی۔ ایک اعلی تخلیق کار اس طرح منظر اور جزئیات کو اپنے اظہار کا حصہ بناتا ہے کہ اس کی تحریر میں تجسیم کاری نمایاں ہوتی ہے۔ افسانے کے فن کا بینادی تقاضا ہے کہ اس کے ذریعے حقائق حیات کی آئینہ سامانی میں افسانہ کا فن انسانی معاشرے کی سرگرمیوں اور ان سے پیدا ہونے والی مختلف النوع کیفیتوں کی عکاسی کرتا ہے۔ یعنی افسانہ بنیادی طور پر تخیلات سے زیادہ تجربات حیات کا شعور رکھتا ہے۔ افسانہ نگار محض خواب وخیال کی باتوں کو پیش نہیں کرتا بلکہ خواب وخیال کو بھی زندگی کے حقائق بیان کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ افسانہ کے واقعہ میں تفریح کا عنصر ضرور ہوتا ہے مگر اس کی نوعیت ذیلی ہوتی ہے۔ اس کا اہتمام صرف اس حد تک ہوتا ہے کہ جس سے افسانہ میں واقعات کی کشش اور جاذبیت برقرار رہے۔ افسانہ کا فن حقائق حیات کی روشنی میں سنورتا اور نکھرتا ہے۔ دلچسپی اور تفریح کا عنصر اس کے اندر حسن واثر کی وہ کیفیت پیدا کرتا ہے۔ جس سے قاری کو نشاط ومسرت کا سرمایہ حاصل ہوتا ہے۔ افسانوں کے ذریعے زندگی کے معاملات اور حقائق کی عکاسی ہوتی ہے چونکہ زندگی خود ایک تغیر پذیر قوت ہے لہذا فطری طور پر زندگی میں تغیرات برپا ہوتے ہیں۔ ایک افسانہ نگار جو ایک انسان ہونے کی وجہ سے خیالات، محسوسات کا مرکز ہوتا ہے۔ اور زندگی کو ایک مخصوص نقطہ نظر سے دیکھنے کی وجہ سے دوسروں کے خیالات اور محسوسات سے بھی روشنی محسوس کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھنے والے پر افسانہ نگار کے نظریے، تصور اور مقصد کا اثر ہوتا ہے۔ منظر نگاری سے افسانے کی دلکشی میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ پلاٹ اور کردار کی توجیح میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ لیکن یہ صرف ان ہی فن کاروں کا طریق ہے جنہوں نے فطرت کو اپنا معلم بنایا ہے۔۔ مشاہدہ کائنات میں مناظر قدرت کی رنگینیاں بسی ہوئی ہیں۔ بہار، دریا، آبشار، کھیتیاں، باغ، نہریں، سبزہ زار کے علاوہ انسانی اعمال امیری کے ٹھاٹ باٹ غریبی

کے دکھ اور بے کسی، بچپن، بڑھاپے اور جوانی کے مختلف رنگ روپ اور تہذیب تمدن وغیرہ **بانو قدسیہ** کے ہاں بطرز نگاری میں یہ تمام جہتیں واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہیں۔

،،وقار عظیم کے بقول:

،، کہانی حقائق کی دنیا سے دور تخیل، تصور اور رومان
کے ایک جہان تازہ کی تصویر ہے۔ کہانی کا یہی
تصور ہماری داستان کا بنیادی تصور ہے۔،،4

بانو قدسیہ نے اپنے تمام افسانوی مجموعے بازگشت، امر بیل، کچھ اور نہیں، دانت کا دستہ قابل ذکر ہیں جبکہ دوسرا دروازہ، آتش زیر پا، سامان وجود ایسے افسانوی مجموعے ایک دن، پروا، موم کی گلیاں، شہر بے مثال، وغیرہ اہم تصانیف ہیں۔ بانو قدسیہ موضوعاتی تنوعات، مربوط و منتظم مدلل رویوں اور اپنے اہم فکری رجحانات کے باعث ایک منفرد دبستان کی موجد ہیں۔ جس میں ان کے مجازی خدا اشفاق احمد بھی ان کے ہمراہ کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ بانو قدسیہ کی افسانہ نگاری میں ہر طبقہ اور ہر قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں اور ان کے مزاج ان کی کیفیات کو منظر نگاری، جزئیات نگاری کی تکنیک سے بروقت سامنے لاتی ہیں کہ قاری کردار اور حالات کی نفسانی اور نفسیاتی روح سے آگاہ ہو کر ساتھ نبھاتا ہے۔ اعلی طبقے کا کھوکھلا پن، متوسط طبقے کا اضطراب اور نچلے طبقے کی محرومیاں اور یاسیت نیز ان کرداروں کی داخلی نفسیات کہانی میں یک جان ہو جاتی ہے۔ اور یہی ایک باشعور لکھاری کی صفت ہے۔ بانو قدسیہ کہانی بیان کرتے ہوئے قاری کے جذباتی مدوجزر میں فصاحت کا رنگ اس طرح سے شامل کرتی ہیں کہ شعبدہ بازی سے کم نہیں لگتا۔ مشیت کو یہی منظور ہے کہ جہاں ہوں ٹاپ لائٹ ان پر فوکس ہوتی ہے۔ مثلاً وہ اگر کسی کردار کا تعارف کروائیں گی تو اس کی ساری حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ افسانہ "واماندگی شوق" میں زندگی پورے تحرک اور مزاج کے ابھرتی ہے

،، پولی درمیانے قد کی دبلی سی لڑکی تھی۔ صاف کھلتا ہوا گندمی رنگ اور ساٹن کی
طرح ملائم جلد، اسے چٹی گوری کشمیری لڑکیوں میں بھی ایک امتیازی حیثیت بخشتی
تھی، لیکن پولی کے پاس سب سے خوبصورت چیز اس کی آنکھیں تھیں، جس کی طرف
ایک بار آٹھا کر دیکھ لیتی، وہی اس کا گرویدہ ہو جاتا۔ پھر بھی مجھے تعجب ہے کہ کوئی
لڑکا اس کے پیچھے دیوانہ نہ ہوا۔ وہ بڑے اطمینان سے اکیلی سائیکل پر کالج
آتی اور ویسے ہی چلی جاتی۔ اس کی شربتی آنکھیں عموماً غم ناک رہا کرتی تھیں۔
اور جب کبھی وہ بل کھا کھا کر دیر تک ہنستی رہتی تو اس کی انہی آنکھوں میں
ایکا ایکی موٹے موٹے آنسو لرزنے لگے۔،،5

افسانے میں راوی کے مطابق،، خوبصورتی میں تو یہ جملہ کرداروں جمیلہ، پولی، شاہدہ اور نینا کے پاس بھی نہیں تھی، لیکن اس کی منفرد مزاجی افسانے کی روای لڑکی بخوبی جانتی تھی۔ اس کی آرزو تھی:

"اگر میں لڑکا ہوتی تو ضرور پولی سے شادی کر لیتی۔
اس کی تھکی تھکی آنکھوں کو ہر گھڑی گردش کرنے سے
بچا لیتی۔ اس کے ذہن سے پرانی یادوں کو دھوڈالنے کی
کوشش کرتی،، لیکن افسوس کہ میں لڑکا نہ ہو سکی۔،،6

یہ مکالمہ صیغہ واحد متکلم میں ہے جب کہ دوسری طرف پولی ایک زیرک، ہوش مند، زندگی کی اصل حیقیت کو سمجھنے اور ان کا بہتر تجزیہ کرنے والی لڑکی ہے۔ یہ تعارف بظاہر افسانے کے مرکزی کردار پولی کی شخصیت سے آگاہی کے لیے ہے مگر ساتھ ہی ساتھ کردار کی داخلی پراسراریت کا تجسس بھی بڑھ رہا ہے۔ واماندگی شوق،، انسانی زندگی کے اس دور کا افسانہ ہے جب جسم میں بلوغت کی پہلی لہر اٹھتی ہے۔ اور نسوانی حسن کشش انگیزی کی زد میں ہوتا ہے ایسی لڑکی کی کہانی جو عمر کے مختلف مدراج میں اپنی ہم عمر لڑکیوں سے بالکل الگ رد عمل کی علامت ہے۔ واماندگی شوق،، بانو قدسیہ کا پہلا شہکار ہے جس میں ان کا فن کھل کر سامنے آیا۔ جس میں انہوں نے زندگی کی امیدوں اور محرومیوں کو حوصلہ مندی سے دیکھا۔ اور نظر کی پختگی کا ثبوت دیا، اور افسانے کے دروبست کو اس طرح ترتیب دیا کہ ان کی فنی پختگی اپنا اظہار خود کرنے لگی۔ ان کے پہلے افسانے نے اردو ادب میں اپنا مقام مقرر کر لیا۔ ماہنامہ ادب لطیف

،،

میں شائع ہوا۔ بانو قدسیہ خود اصغر عبداللہ کو ایک انٹرویو میں بیان کرتی ہیں کہ:

،،میں اتنی معروف ادیبہ تو نہ تھی کہ لوگ میری کہانیوں کی طرف متوجہ ہوتے، نہ کہ لوگ
میری طرف نظر کرتے۔،،7

منظر نگاری کے ذریعے وجود کی اہمیت افسانوں میں بانو قدسیہ کی الگ انوکھی خوبی ہے۔ اس حوالے سے بانو قدسیہ کے بہترین افسانے،، کلو،، کا ذکر از حد ضروری ہے۔ جو ان کی ابتدائی شہرت میں اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں مرکز کردار کلثوم کا اختصاریہ۔۔ کلو،، تھا۔ مگر یہ کوئی بے معنی تفنن نہیں تھا۔ یہ نک نیم اس کردار کے رنگ اور چہرے کی مناسبت سے دیا گیا تھا۔ بھری مجلس میں کم گو اور صابر نیک فطرت کلو اپنے داخلی کردار کی عکاسی ہے۔ سجو کی کیفیت کلو کے رخصت ہو جانے کے بعد کچھ اس طرح ہو جاتی ہے:

،،اور مجھے اماں کی سبز آنکھیں اور ان کا سرخ و سپید چہرہ، اپنے بستر پر جھکا ہوا،
ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔ مجھے رضیہ اچھی نہیں لگتی، جس کی سفید جلد
پیاز کی پرت ایک سے ہیں، اور تو اور مجھے تو آمنہ سے بھی چڑ ہو گئی

ہے۔ جس کی نیلی آنکھیں دیکھ کر میں بے ہوش سا ہو گیا تھا۔ ان سارے

چہروں پر ایک اندھیرا چھا گیا ہے۔ ایک سیاہی سی حلول کر گئی ہے۔

اور سیاہی تو مجھے کبھی بھی پسند نہ تھی۔،،8

بانو کے اس افسانے کا مرکزی موضوع،، کالے اور گورے،، کی تفاوت کو نمایاں کرنا ہے جو انسانی رویوں کو انسانیت سوز حد تک گمراہ کر دیتا ہے۔ بانو قدسیہ نے اس افسانے میں داخلی فضا کو ممکنہ طور پر حزینہ بنایا ہے تاکہ وہ کرب ابھر سکے۔ متن میں ان کے جملے جگنوؤں کی طرح دمکتے پھرتے ہیں اور کردار کی ظاہری سیاہی کو روشنی سے چمکدار کر دیتے ہیں۔ چند جملے یوں ہیں:

،،وہ اپنے کمرے میں یوں بھٹک کر داخل ہوتا ہے گویا کسی اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں گھڑی بھر کو ٹھہر گیا ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔،،

،،ایک دن اس نے بیٹھے بیٹھے بال کھول کر کندھوں پر بکھیرے تھے اور انہیں جھٹکتے ہوئے کہا تھا، لو اب اندھیری رات آئے گی

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔،،

،،آنکھوں میں دیے روشن تھے جنھیں جسمانی محبت نے جگایا تھا۔،،

،،ایک افسردگی ہے جو صبح و شام اوس بن کر ہمارے در و دیوار

کو نم کیئے رکھتی ہے۔،،

جب کبھی وہ مجھے نلکا چلاتی ہوئی نظر آتی تو مجھے احساس

ہوتا کہ اس لڑکی کے سارے انگ ڈھیلے ہیں۔،، یہ اس لحاف کی طرح

ہے جس میں جابجا روئی اکٹھی ہو چکی ہے۔،،9

ان تمام جزئیات کے ساتھ مصنفہ اپنے فکری اور ذہنی پہلوؤں سے کہانی کی بنت کو باأثر کرنے میں بے حد کامیاب تاثر مرتب کرتی ہیں۔ ڈاکٹر انوار احمد افسانہ

کلو،، کے بارے یوں لکھتے ہیں:

،، کلو سے ان کے تخلیقی تعارف کا حقیقی آغاز ہوا اور بانو

کی جانب سے معاشرے کے دھتکارے ہوئے یا نظرانداز کیے

جانے والے لوگوں کو جذباتی کمک پہنچانے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔

کہنے کو تو اس کہانی کی فضا میں روایتی رنگ گھلے ہوئے ہیں،

مگر اس میں چند مکالمے اور تخلیق کار کا فنی رویہ ایسا ہے۔ کہ

احساس ہوتا ہے کہ اردو میں ایک منفرد افسانہ نگار طلوع ہو رہا

ہے۔ بانو نے اشیاء افراد اور محسوسات وافکار کے بطن میں
جھانک کر اپنے عہد کے معنی دریافت کرنے کی کوشش کی اور
یہ جھانکنا نسوانی فطرت کا تقاضا تو ہوگا ہی مگر انہوں نے یہ ثابت کیا
کہ یہ تجسس اور اضطراب ایک دردمند باشعور شخص کا ہے۔،،10

بانو قدسیہ کا افسانہ ،، موج محیط آب اس شادی شدہ عورت کی آپ بیتی پر مبنی کہانی ہے، جس نے اپنے خواب اپنی چار بڑی بہنوں کی شادیوں کی پہلی رات کی تعبیر سے بنے، مگر جب اس کی اپنی باری آئی ان نازک خوابوں کا اصل احساس کشید کرنے کی تو یہ خواب پہلی ہی رات کو جس دردناک انجام سے چور چور ہوا اس کی تکلیف اس مرکزی کردار ،، مینا،، کی روح تک کو گھائل کر گیا۔ یہ لڑکی مینا ہی ہے جو شب زفاف ،، سے اٹھی تو اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے زبردستی کھاری بوتل میں ریت ملا کر پلادی ہے جس کچر کچرا سے دانتوں کی رگڑ میں محسوس ہو رہی ہے۔ مینا نے اپنی شادی کے لیے جس شوق اور الہڑپن سے زیورات اور کپڑے تیار کروائے سخت گرم دوپہروں میں بازاروں کے چکر وہ مشقت اسے رائیگاں ہوتی ہوئی ملی۔ لیکن اب وہ محنت کچھ یوں سامنے تھی:

،، سارا زیور تپائی پر خربوزے کے چھلکوں کی طرح بے وقعت پڑا تھا،
کئی بار اس کے جی میں آئی کہ ایک ایک زیور کو ہتھیلیوں میں لے کر
ان کا مرونڈا بنا ڈالے، لیکن صدیوں سے عورت وہ سب کچھ نہیں
کرتی جو اس کا جی چاہتا ہے۔ اسی لیے اسی عورت (مینا)
نے بھی صرف اس طرف پیٹھ موڑ لی اور لمبی سی آہ بھر کر
خاموش ہو گئی۔،،11

بانو قدسیہ اس افسانے میں باریکی سے عورت کی سوچ اور داخلی احساسات کو ابھارتی کہ کہ وہ بھی ایک جیتا جاگتا وجود ہے جسے رویے اور بے رخی، مردانہ انا پرستی، اپنی ذات کی تذلیل اور سب سے بڑھ کر محبت کی غیر موجودگی کس طرح کم مائیگی کا شکار کر دیتی ہے کہ پھر موت کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ مینا اپنی چاروں بہنوں کی شادیوں کے اولین دنوں میں خاندان بھر افق پر ستاروں کی چمکتے دیکھا تو فطری طور پر اس کے خواب اپنا جواز خود بناتے گئے۔ اور روشنی کی ان لکیروں سے کامیابی کے نقوش سنورتے گئے۔ ایک خوش رنگ منظر یوں سامنے آتا ہے:

،، آسیہ باجی کے ولیمے پر پہنچی تو نظارہ ہی خیرہ کن تھا۔ آسیہ باجی میک اپ کر
رہی تھیں اور دلہا بھائی ڈریسنگ ٹیبل پر بیٹھے کبھی پنیں پکڑاتے تھے کبھی لپ
سٹک کا ڈھکنا کھول کر دیتے تھے۔ باجی کی قمیض پر پشت کی

جانب لمبی زپ تھی جو بھائی جان نے خود بند کی اور خدا جانے

آسیہ باجی کے کان مین کیا کہا کہ وہ کان، ناک، آنکھیں،

سرخ کیے۔۔۔۔ کٹی پتنگ کی طرح ڈولنے لگی۔،،12

اس افسانے کی واحد غائب راوی بانو قدسیہ نے مینا کے خوابوں کو جس شدت اور چبھتی کاٹ کے ساتھ پیش کیا کوئی اور اس طرح بیان سے قاصر ہے۔آسیہ باجی کا دولہا اگر سب کی نظروں کا تارا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ :

،،ایسی ہری بھری گفتگو کرتا کہ سارے گھر والے چرند پرند بنے اس کی ہریالی

میں چونچیں مارتے تھے۔ لیکن دولہا والے کمرے کی چٹخنی نہیں لگی۔

کبھی آسیہ باجی اور دولہا بھائی اکیلے نہیں بیٹھے۔ایک بارات۔۔۔ایک جلوس

،ایک مشاعرہ۔۔۔ایک پلیٹ فارم کا سا منظر ہوتا۔دولہا بھائی کے آنے پر

سب بیٹھے ہیں۔ ٹیلی ویژن کے سامنے پروگرام پر تبصرہ جاری ہے۔

دولہا بھائی اور باجی کی نظریں ایک دوسرے کی طرف ہرکارے دوڑا

رہی ہیں۔ جو بات باجی کو پسند آتی وہ کھٹ سے دولہا بھائی کو دیکھتی ہیں

،وہاں سے جوابی مہر لگ کر رائے عامہ ہو جاتی ہے۔ جلوت میں خلوت

کے مزے ہیں۔ بھری محفل میں معاشقہ جاری ہے۔آم کھائے جا رہے ہیں۔

ہر میٹھا آم جو باجی کو ملتا وہ بھائی کو پہنچ جاتا ہے۔ جو میٹھا آم بھائی جان

کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ باجی چوستی نظر آتی ہیں، ہر طرف بغیر محبت کا الوہی انداز

۔۔۔ہر طرف عشق ہی عشق۔۔۔اور لمس بھی نظر نہیں آتا۔،،13

بانو قدسیہ نے جزئیات نگاری سے تمام کرداروں کی ایک دوسرے کی شخصی معاونت کو سامنے لاتی ہیں،اور سب سے اہم نکتہ کہانی کے پلاٹ کو مربوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ان کا اگلا افسانہ جو منظر نگاری اور جزئیات نگاری کے حوالے قابل قدر ہے۔،،ہو نقش اگر باطل،، بھی ایک شادی شدہ جوڑے عفیہ اور ڈاکٹر کی کہانی ہے جس میں ایک تیسرا کردار زمبا(زینب) داخل ہوتا ہے۔تو اس مختصر خاندان کی کایا پلٹ دینے کا باعث ہے۔ بانو کی یہ خوب ہے کہ وہ ان تینوں کرداروں کی جذباتی سوچ ان کی داخلی کشمکش کو عملی سطح پر پیش کرتی ہیں۔اسے اپنے شکوک شبہات، نیک نیتی کے ضمیر میں پیدا کردہ وہم کی شاخسانے ہیں۔تینوں کردار محبت کی نازک ڈور میں بندھے ہیں۔ لیکن افسانے کا راوی ڈاکٹر نمو بیان کرتا ہے کہ :

،،ہم تینوں نے بڑی وضع داری، بڑی محبت اور بڑے خلوص سے ایک دوسرے

کی زندگی تباہ کر دی۔ نیکیاں مجروح کرتی ہیں۔۔۔ محبت نے محبت کا گلا
گھونٹ دیا۔ شرافت نے بڑی شرافت سے جان لی۔ ہم تینوں کو ایک
دوسرے کے دل کا اس قدر احساس تھا کہ بالآخر اسی خیال نے تینوں دل
کھرل میں ڈال کر کشتہ کر ڈالے۔،،14

بانو نے عطیہ اور زمبا کو حقیقی زندگی کے دو دھارے بنا کر پیش کیا ہے۔ جو واحد متکلم راوی کے مرکزے پر اتفاقیہ جمع ہو جاتے ہیں۔ متذکرہ عورتوں کے حوالے سے راوی یوں بیان کرتا ہے۔

،،عطیہ میری زندگی میں اس طرح آئی جیسے ساون میں بارش برستی ہے
اور جس بارش سے پرنالے ٹوٹ جاتے ہیں۔ چھتیں بیٹھ جاتی ہیں،
اور سڑکوں پر متعفن پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔ زمبا میری زندگی میں
وہ گلاس بھر پانی بن کر آئی جو ریگستان میں تپی ہوئی دوپہر
کے وقت ملتا ہے۔ اور جس پر کسی دشمن کی سنگین۔۔۔ پہرے
میں کھڑی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ عطیہ میرے جسم کا میری غلطیوں کا، میری
عادتوں کا مجموعہ تھی، اور زمبا وہ سائیکوانیلسٹ تھی۔ جس کے
سامنے مجھے اپنے وجود سے اپنی عادتوں سے اپنی انا سے چھٹکارا
حاصل کرنے کے امکانات نظر آتے ہیں۔،،15

ان اقتباسات میں راوی نے اس تکون کے تمام ممکنہ زاویے پیش کیے ہیں۔ جس کا ایک اہم زاویہ اس کی اپنی ذات تھی۔ باقی دو مبہم پہلو عطیہ اور زمبا تھے۔ وہ اس حقیقت سے بھی واقف تھی کہ وہ اپنے ڈاکٹر شوہر کے آدرشی چوکھٹے میں بالکل مس فٹ تھی۔ اسی لیے فیصلہ کر چکی تھی کہ جب بھی اس کے شوہر کی زندگی میں بہتر لڑکی آگئی تو وہ اپنی جگہ خود سے چھوڑ دے گی اور انجام میں اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ اپنے شوہر کے زمبا سے دوستی کے ذکر پر ہی کہہ دیتی ہے:

،،جب وہ آئے گی تو میدان خالی پائے گی۔ میں خزانے کا سانپ بن کر آپ پر
پہرہ نہیں دوں گی۔۔۔ میں تو،،، مجھے تو۔۔۔۔۔۔۔ اگر یقین ہو گیا کہ آپ کی خوشی
اس سے وابستہ ہے تو میں آپ سے یوں علیحدہ ہو جاوں گی جیسے پکا ہوا پھل ڈال
سے گرتا ہے۔۔۔ خود بخود۔۔۔ اپنے بوجھ سے۔۔۔،،16

راوی واحد متکلم جو چوری سے زمبا کی محبت میں مبتلا ہوا۔اور عطیہ کی قربت میں فرار اختیار کرتا ہے یہ حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔

،،مجھے عطیہ کا سویا چہرہ جاگتا نظر آتا ہے

میں زمبا کی انگلی پکڑ کر عطیہ کے حضور جا کھڑا

ہوتا ہوں۔۔۔اور پرانے حساب چکانے لگتا ہوں۔،،17

بانو قدسیہ نے اس کردار کے باطنی گوشوں کو جانچا ہے خود راوی کی زبان سے اعتراف کروایا ہے۔اور اسے انسانی معاشرے کا حقیقی دوہرا کردار بنا دیا ہے۔ منظر نگاری اور جزئیات کے حوالے سے بانو قدسیہ کے افسانے معاشرتی حقائق میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ان مین عمومی باتوں کو بے پناہ مسرت کا باعث بنایا گیا ہے۔اور اکثر پہاڑ جیسی مصیبتوں کو روئی کے گالوں سے ہلکا ظاہر کیا جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے بانو کلیوڈوسکوپ کی حرکت سے معاشرے میں رنگ بھرنے جا رہی ہیں۔وہ کسی کو مورد الزام قرار نہیں دیتی،وہ کسی طبقے،کسی خاص تصور کو اعتراض کی زد میں نہیں لاتیں۔وہ قاری کی توقعات پر تلوار نہیں چلاتیں۔قاری ان افسانوں میں اٹھائے سوالوں کی گرفت میں خود آتا ہے۔ان کے افسانے اصلاح اور تربیت کی آزادی لیے ہوئے ہیں۔منظر نگاری اور جزئیات نگاری کے حوالے سے ان کے بہترین افسانے بے شمار ہیں مگر چند ایک درج ذیل ہیں:

کہانی کار اپنی بے مثل بصیرت سے کہاں کہاں کرداروں کی تار پود کو جوڑتا ہے بانو قدسیہ نے اس خاص تکنیک کو ان افسانوں میں برتا ہے۔سوغات،آنسو، جل سینچ سینچ،امر بیل،مجازی خدا،موج محیط آب،سامان شیون،اور ہو نقش اگر باطل،کلو،بازگشت،توجہ کی طالب،انتر ہوت اداسی،تنکے کا سہارا،خانہ جنگی،دشت امکاں،آتش زیر پا،ذات کا محاسبہ،ابن آدم،نیو ورلڈ آڈر،موسم سرما میں نیل،چڑیا کی موت حجاب،کھڑاویں،دل یزداں اور دیگر نمایاں تصانیف ان کے فنی تجربات کی عکاس ہیں۔

بانو قدسیہ کے افسانوں میں کہانیوں کے پلاٹ کا جائزہ

ناول یا افسانہ میں قصہ اور واقعات بنت اور ترتیب و ربط افسانہ نگاری کے فن میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔افسانے میں پلاٹ کی اصطلاح دیگر اصول و قواعد کے ساتھ الگ خاصیت اور فوقیت کی حامل ہے۔اگرچہ پلاٹ سے مراد ہے کہ قصہ،واقعہ ایسی منطقی ترتیب سے ایک بنت میں ڈھل جائیں کہ ان میں آغاز، وسط اور انجام کا تعلق گہرا ہو اور اس کی ترتیب میں ایک تعمیری ربط مسلسل نمایاں رہے۔چونکہ پلاٹ کی خاصیت یہ ہے کہ کہانی میں جھول اور بے ربطگی پیدا نہ ہو سکے۔یہ ایک اہم حقیقت ہے کہ ادب کی متوازن پیشکش میں پلاٹ کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔کامپٹن برنٹ نے لکھا ہے کہ

A plot gives rise to secondary scenes, that bring put personality, and give sope for revealing harater. If the plot were taken out of a book. a good deal of what may seem unonneted with it, would have to go.,,

-18(novelist on the novel by Miriam Allott(p.249

در حقیقت پلاٹ ایک ایسا فنی ڈھانچہ اور تکینک ہے جو کہانی کے سب عناصر کو ابھارتے ہیں اور واقعات کو ایک خاص تسلسل اور ربط عطا کرتے ہیں۔ پلاٹ کے اہم اجزا درج ذیل ہیں۔

ا۔نقطہ آغاز

۲۔نقطہ عروج

۳۔انجام

افسانے کے پلاٹ میں اہم ترین جزو تصادم ہے جس میں داخلی اور خارجی سطح پر کہانی کا مرکزی کردار اور کہانی ابتدائی تعارف میں قاری کی دلچسپی اور تجسس کو قائم رکھنا ہے۔ یہیں کہانی کے بنیادی کرداروں اور ثانوی کرداروں میں کہانی کی فضا کے ساتھ تصادم ہوتا ہے۔ داخلی طور پر اس کی ذات کے ساتھ مسلسل موجود رہتا ہے۔ اور یہ بنیادی تضادات کی کیفیت کہانی کے پلاٹ سے ہی جڑی ہوتی ہے۔ اور در حقیقت یہی پلاٹ کی تشکیل میں معاونت کا باعث بھی ہیں۔ اسی کے ذریعے سے عمل کو حقیقت کے قریب تر کیا جاتا ہے یہی بہترین پلاٹ کی خوبی ہے کہ مصنف قاری کو افسانے کے آغاز سے اختتام تک متعارف کرواتا ہے۔ اور اتار چڑھاو سے بر وقت آگاہی بھی مہیا کرتا ہے۔ ڈاکٹر سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

> پلاٹ جو افسانہ نگاری کے فن میں پہلے سب کچھ تھا اب حقیقت کا ایک زیادہ
> وسیع اور غیر متعین مفہوم پیدا ہو جانے کے بعد اپنے اثر کو زائل کر رہا ہے۔
> پھر بھی چونکہ ،، شعور کی رو،، کے استعمال میں افسانہ کے لئے خطرے
> زیادہ ہے اور اس طریقے سے پڑھنے والوں کی ایک کثیر تعداد کی دلچسپی کے
> زائل ہو جانے کا اندیشہ اور یقین ہے اس لیے نفسیات کے ہر نظریے کے رواج کے
> باوجود پلاٹ کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آتی۔،،19

جدید دور کے بیشتر افسانہ نگاروں نے افسانے کے اہم عنصر کہانی کو ملحوظ رکھا۔ اشفاق احمد کی طرح بانو قدسیہ نے پلاٹ کے روایتی اصول و قواعد سے کلی انحراف تو نہیں کیا مگر جہاں تک تکنیک کا تعلق ہے نئے تجربوں اور نئی وسعتوں کو اپنی گرفت میں لیا ہے۔ کچھ افسانوں میں پلاٹ ایسے بھی ہیں جن میں واقعات آغاز، وسط اور انجام سیدھے خطوط پر لکھے گئے ہیں۔ بیشتر افسانوں میں شعور کی رو، خود کلامی، تلازمہ خیال اور فلیش بیک کی تکنیک کو برت کر کہانی کی شکست وریخت کا احساس ابھارا ہے۔ پلاٹ کے لحاظ بانو قدسیہ کے چند نمایاں افسانوں کا جائزہ لیا جائے گا جن میں پلاٹ کے دونوں تناظرات کی نمائندگی مد نظر ہو گی۔

بانو قدسیہ کے افسانے ،، واماندگی شوق،، کہانی کا آغاز ایک ٹریجڈی سے شروع ہوتا ہے جس میں انسانی جذبات، ذہنی کیفیات اور محبت کے جذبات کی لاابالی اور وقتی کشش کے امکانات اور نتائج کو ایک ربط و تنظیم کے ساتھ منطقی انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ کہانی ایک مخصوص جذباتی ماحولیاتی پس منظر میں شروع

ہوتی ہے۔افسانہ نگار نے آغاز میں زندگی کے تحرک کو فطری انداز میں بیان کیا ہے اور شوق کی وسعتوں میں گم ہوتا ہے کہانی کا ربط سامنے آتا ہے۔ بانو قدسیہ زندگی کے سماجی کرداروں کے رویے اور اخلاقیات پر گہری نگاہ رکھتی ہیں۔اس کی ایک واضح علامت اس افسانے کا مرکزی کردار کا اپنی ذات کے خول مقید ہونا ایک انتقامی جذبہ ابھارتا ہے جو فطرت سے اپنی خواہشات کے عدم تکمیل کے باعث وہ فطرت سے بدلہ لیتا ہے۔ مرکزی کردار،،پولی،،اپنی اقدار اور عزت کے باعث مقصود کی التفات کو رد کر دیتی ہے جو وقت گزاری کے تحت اسے ایک آزاد خیال لڑکی سمجھ کر محبت کا اظہار کرتا ہے کہانی واحد متکلم راوی کے بیانیہ انداز شروع ہوتی ہے جس میں وہ،،پولی،،مرکزی کردار کا تعارف کرواتی ہیں،۔ کہانی کار ایک خاص ربط اور واقعات کی ترتیب سے قاری کی فہم کو راستہ دیتا ہے تاکہ وہ اصل کردار کی داخلی کیفیات کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو سکے۔

،،پولی،،درمیانے قد کی دبلی پتلی سی لڑکی تھی۔ صاف کھلتا ہوا گندمی
رنگ،اور ساٹن کی طرح ملائم جلد،اسے چٹی گوری کشمیری لڑکیوں
میں بھی ایک امتیازی حیثیت بخشتی تھی،،لیکن پولی کے پاس سب سے
خوبصورت چیز اس کی آنکھیں، جس کی طرف ایک بار اٹھا کر دیکھ لیتی،
وہی اس کا گرویدہ ہو جاتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔،،20

کہانی میں بنیادی طور پر قدرت کے فیصلوں سے ٹکراو کو کردار کے مکالمے سے نمایاں بھی کیا گیا۔،،پولی کے الفاظ میں:،،ٹریجڈی یہ نہیں کہ اسے (مقصود کو) محبت کا جواب محبت میں نہیں ملا۔ ٹریجڈی یہ ہے کہ اس نے زندگی جیسی نعمت کی قدر نہیں کی۔،،

کہانی کے داخلی تضادات جو اس کے واقعات کی ترتیب اور استدال کو سامنے لاتے ہیں۔ وہ ان کرداروں کی جنگ اور معاشرتی دباو کے خلاف مزاحمتی رجعت پذیری ہے جو کہانی کے اندروں میں خاص ارتقا کا باعث بھی ہے اور مصنف کے مقصد کی جانب پھیلاو بھی۔اس کے علاوہ اس افسانے میں،،پولی کردار کی تصویر کشی زیرک،ہوشمندی کے حوالے زندگی کی حقیقتوں کا تجزیہ خود بخود اجاگر ہو جاتا ہے۔،،

فلیش بیک کی تکنیک میں لکھی ہوئی یہ کہانی ایک مضبوط اقدار و روایات کی پروردہ باکردار لڑکی کی کہانی ہے،جو اپنے جذبہ محبت کی آبیاری کی خواہش مند تو ہے مگر زندگی کے حقائق کا پورا ادراک رکھتی ہے۔

،،وہ اپنی ہم مذہب عیسائی لڑکیوں سے کس قدر مختلف تھی۔ عام
عیسائی لڑکیاں اپنے مذہب کا تمسخر اڑاتیں،ہندو لڑکیوں کی تقلید میں بندی
لگاتیں،چولی پہنتیں اور لڑکوں کے ساتھ دوستی لگانے کا وجدید فیشن
تصور کرتیں بلکہ ان کے برعکس پولی مزہبی قسم کی واقع ہوئی تھی،
وہ چیپل میں سر جھکا کر دعا مانگتی اور جب سر اٹھاتی تو اس کی آنکھوں

میں آنسو تیرتے ہوتے۔،، 21

بظاہر یہ جملے پولی کے انفرادی کردار کی شناخت کی دلیل ہیں مگر بانو قدسیہ پولی کے ماضی کے راز سے پردہ اٹھاتی ہیں کہ وہ کالج میں رومانویت کا شکار ہو چکی تھی اور فلیش بیک کی تکنیک سے راز منکشف ہوتا ہے۔ کہانی کے پلاٹ میں واقعات کی پیشکش کے ساتھ ہی سیاسی سماجی، انسانی رشتوں میں ہوس مندی، ظاہری بناوٹ، دھوکہ فریب پر گہرا طنز دکھائی دیتا ہے۔ اور محبت کا جذبہ پولی کے دل میں بے اعتباری اور رد عمل فطری اور انسانی رویے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے یہاں یہ ماننا حقیقت کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے کہ مصنفہ کس قدر گہرے مطالعے سے معاشرتی رویوں کو واقعات میں یکے بعد دیگرے سمویا ہے کہ پلاٹ میں جھول یا گرفت ڈھیلی نہیں ہوتی۔ وہ مرکزی کردار کی انگلی تھامے اسے حالات کے پیچ و خم سے گزارتی ہیں اور کہانی میں منطقی نتائج قاری کے ذہن میں قبولیت کا احساس اجاگر کرتے جاتے ہیں۔

بانو قدسیہ کے ایک اور افسانے،، کلو،، کا عنوان اس کے مرکزی کردار کے نام پر رکھا گیا ہے جو اس کردار کی داخلی صورتحال کو سامنے لاتا ہے اور موضوع اسلوب کی تلمیح بن کر کہانی کی پرتیں کھولتا ہے۔ مگر یہیں مصنفہ نے اس پہلو کا اہتمام بھی کیا اسلوب بیان بیانیہ ہو یا مکالماتی خود کلامی ہو خیالی مکالمہ بہت جملے برجستہ بر محل اور مضبوط طرز پر ہونا ضروری ہے اور بانو قدسیہ اس پہلو سے ایک بڑی منجھی ہوئی کہانی کار ہیں۔ کیونکہ اگر موضوع منفرد اور انوکھا بھی ہو، اگر اسلوب کمزور اور الجھا ہوا ہو گا تو کہانی کی گرہیں کھلنا، یا اس میں ربط آنا مشکل ہے۔

واقعات کا ربط اور کرداروں کی نفسیات ان کے عملی رویے اور ان کا داخلی اور خارجی رد عمل عین فطری تقاضوں پر مبنی دکھایا گیا ہے۔ کہانی کا مضبوط پلاٹ مصنفہ کے متعین مقصد کی بھرپور تائید کرتا ہے۔ اس افسانے میں بانو قدسیہ نے دوہرا پلاٹ استعمال کیا ہے۔ جس میں ایک سطح پر مرکزی کردار کلو اور سجو کی محبت جو لاابالی طور پر نفرت سے محبت میں بدل جاتی ہے اور دوسری سطح پر معاشرتی برائیوں میں کالے اور گورے کی رنگ و نسل کی تفریق جسے مصنفہ انگریزوں کی دین گردانتی ہے ساتھ ساتھ چلتی ہے اس اقتباس میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

،، ہم مشرقی لوگ عجیب بے تکے ہوتے ہیں۔ برسوں انگریزوں کی

غلامی میں رہے اور جب

کبھی اس نے ہمیں،، کالا آدمی،، کہہ کر مخاطب کیا تو ہمارا خون

کھولنے لگا۔ آج بھی

ہم امریکیوں کو نیگرو لوگوں سے نفرت کرنے پر لعنت ملامت

کرتے ہیں،، لیکن

ہمارے اپنے ہاں گورے کالے کا ایسا لمبا سلسلہ چلتا ہے کہ محبوب

کی طرح سمٹنے ہی

میں نہیں آتا۔ میرا یہ افسانہ میرے اس خیال کی شاید اچھی طرح تشریح
نہ کر سکا ہو،
لیکن مجھے اتنی خوشی ضرور ہے کہ میں نے اپنی سی کوشش ضرور
کی ہے۔،،22

کالے گورے کا خیال اس افسانے کے متعین پھیلاو میں ہر جگہ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اصل حقیقت، کہانی کا تضاد بانو قدسیہ کے اس ابتدائی جملے میں کھل جاتا ہے۔

،،جب کسی بدصورت عورت کا روپ ڈس لیتا ہے تو انسان جنم جنم کا روگی بن جاتا ہے۔،، بانو قدسیہ نے اس افسانے کی داخلی فضا کو ایک مخصوص پس منظر کے ساتھ المیہ اور مقصدی رنگ میں پیش کیا ہے۔ متن میں ان کی تخلیق فکر کا ادراک ان کے بے ساختہ جملوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ جیسے لکھتی ہیں:

،،وہ اپنے ہی کمرے میں یوں بھٹک کر داخل ہوتا ہے گویا کسی اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں گھڑی بھر ٹھہرنے آیا ہو۔،،

،،ایک دن اس نے بیٹھے بیٹھے بال کھول کر کندھوں پر بکھیرے تھے اور انہیں جھٹکتے ہوئے کہا تھا،، لو اب اندھیری رات آئے گی۔،،

،،آنکھوں میں ایسے دیے روشن تھے جنھیں جسمانی محبت نے جگایا تھا۔،،

ایک افسردگی ہے جو صبح و شام اوس بن کر ہمارے در و دیوار کو نم کیے رکھتی ہے۔،،

افسانہ کلو کے پلاٹ کے بارے میں ڈاکر انوار احمد جائزہ لیتے ہیں:

کلو،، سے ان کے تخلیقی تعارف کا حقیقی آغاز ہوا اور بانو کی جانب سے معاشرے کے
دھتکارے ہوئے یا نظر انداز جیے جانے والے لوگوں کو جذباتی کمک پہنچانے کا سلسلہ
بھی شروع ہوا۔ کہنے کو تو اس کہانی کی فضا، یار وایتی رنگ گھلے ہوئے ہیں، مگر
اس میں چند مکالمے اور تخلیق کا کافنی رویہ ایسا ہے کہ احساس ہوتا ہے کہ اردو میں
ایک منفرد افسانہ نگار طلوع ہو رہا ہے۔ بانو نے اشیا افراد اور محسوسات و افکار کے
بطن میں جھانک کر اپنے عہد کے معنی دریافت کرنے کی کوشش کی اور یہ جھانکنا
نسوانی فطرت کا تقاضا تو ہو گا ہی مگر انہوں نے یہ ثابت کیا کہ یہ تجسس اور اضطراب
ایک دردمند باشعور شخص کا ہے۔،،23

امر بیل،، بانو قدسیہ کا ایم افسانہ ہے جس میں تکنیک کے تجربات اور پلاٹ کی بنت کو افسانہ نگاری کے اصول و قواعد کے مطابق برتا گیا ہے کہانی میں کرداروں کا باہمی تصادم اور ٹکراو عمروں کا فاصلہ اور تہذیبوں اور اقدار کا تناظر یک دم بدلتا ہے اور قصہ در قصہ کردار کہانی کے بہاو کے ساتھ تیرتے چلے

جاتے ہیں اور مرکزی کردار،،آصف تنویر،، مختلف عورتوں کی محبت سے گذرتا ہوا ایک لازوال عشق کو انجام تک لانے کا باعث بنتا ہے۔اس افسانے میں بانو قدسیہ نے بیک وقت شعور کی رو، فلیش بیک اور بیانہ کی تکنیک بڑی مہارت سے برتی ہیں اور کہانی کا ایک ابتدائی آہنگ قاری کے سامنے دلچسپی کو ابھارتا ہے۔امر بیل افسانے کا آغاز مرکزی کردار،،ذری،، کی موت کے بعد اس کے خیالی تصور سے خود کلامی کی تکینک میں کیا جاتا ہے۔جس کی محبت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کو جواز اور دلائل سمجھانے کی کوشش میں کہانی کو پیش کیا گیا ہے۔

،،محبت کی امر بیل میں ہمیشہ ہائی سنتھ کے پھول لگتے ہیں۔،،تم نے کبھی ہائی سنتھ کا
پھول دیکھا ہے زری۔؟ہائی سنتھ کا پھول جس کی پنکھڑیوں پر تاسف کے آنسو منجمد ہوں
اور جس کی مخملیں جلد سے جدائی کی خوشبو آئے۔۔۔۔۔لیکن تم نے تو ہائی سنتھ کے پھول
دیکھے بغیر ہی اپنے دل کے نہالچے پر کیوپڈ دیوتا کو سلایا۔
اور پھر آپی آپ ایک رات
پچھلے پہر اس کا گلا گھونٹ دیا۔محبت کا کھیل گنجفہ کا کھیل نہیں
ہوتا زری۔۔۔پھر تم
نے اسے بچوں کی بازی کیوں سمجھا؟؟یہ تو ایک بجھارت ہے۔
ایک کہہ مکرنی ہے،
ایک پنتھ جس کی سمجھ برسوں نہیں آتی۔تم تو ابھی فلیٹ بوٹ پہنتی
تھیں۔کندھے پر دو
چوٹیوں میں سرخ ربن ڈالتی تھیں۔تمہاری عمر آئس کریم کھانے
اور نٹ بال کھیلنے کی
تھی۔پھر تم نے سانپ کی بابنی ہاتھ کیوں ڈالا۔تم سے کس نے
کہا تھا کہ پارے کا کشتہ
اتنی آسانی سے بن جاتا ہے۔تم نے محبت کے لیے ہدف چنا تھا
وہ بڑا پر پیچ تھا۔،24

اس افسانے میں بانو قدسیہ نے شعور کی رو کی تکنیک کو استعمال کرتے ہوئے بھی واقعات کے تسلسل کو برقرار رکھا ہے۔اس کی کہانی کافی پیچیدہ ہے بار بار
قاری کو مرکزی کردار کی اصل

الجھن کو سمجھنے کے لیے واقعات کی طرف لوٹنا پڑتا ہے اور ساتھ پلاٹ میں ربط جو ایک مشکل مرحلہ ہے اس کو مصنفہ نے مہارت سے تنظیم میں پیش کیا ہے کہانی کا آغاز وسط اور انجام ایک ہی کردار،، زری،، کی محبت کے گرد گھومتے ہیں۔ یوں قاری اپنی تمام تر توجہ کہانی کے ساتھ مرکوز کرنی پڑتی کہ وہ سمجھ سکے اصل المیہ مرکزی کردار آصف کا ہے یا اس نوجوان لڑکی زری کا جو کم عمری میں اپنے باپ کے دوست کے محبت میں مبتلا ہو چکی تھی۔

پھر یہیں تلازمہ خیال کی تکنیک کا بھرپور اظہار بھی ملتا ہے جس میں ایک اہم خیال اہم تصور کبھی اکہرا نہیں ہوتا بلکہ ایک خیال سے دوسرا خیال اور دوسرے سے تیسرا خیال روشن ہو جاتا ہے بانو قدسیہ کے کچھ نامور افسانوں میں تلازمہ خیال کا طریق کار بہ خوبی استعمال ہوا ہے۔ امر بیل بھی ان میں سے ایک کہانی ہے جو تلازمہ خیال کی بہترین مثال سے کہانی کے پلاٹ میں گہرائی و گیرائی سے ربط کا ذریعہ ہے۔ اس کی مثال یہ اقتباس ہے جب زری کے وجود سے گفتگو کے ساتھ ہی مرکزی کردار محبت کی گرہیں کھولتے ہوئے اپنے ماضی میں جھانکتا ہے اور ایک پرانی محبت کا حسین تصور ابھر آتا ہے:

آنڈا،، سے پہلی ملاقات نیل کے کنارے ہوئی تھی۔ میں اپنے دیس واپس آ رہا تھا اور وہ
اپنے ہسپانیہ لوٹ رہی تھی۔ مسجد قرطبہ کے عقب میں رہنے والی آنڈا جس کے چمپئی
سینے پر پلاٹنیم کی صلیب آویزاں تھی۔ ہماری ملاقات چند روزہ تھی۔ بادام کے شگوفوں
کی طرح معطر
بیحد نازک اور اپنی موت کے احساس سے لرزاں۔ اس شام ہم دونوں ہوٹل سے اٹھ کر نیل کے
ناسپاس پانیوں میں فاتلے آبیٹھے تھے۔ اندھیرا ست مدعی کی طرح دبے پاوں آگے بڑھ رہا تھا اور قاہرہ شہر
کی بتیاں نیل کے ناسپاس پانیوں میں فانوس رنگ جل بجھ رہی تھیں۔ ان منعکس بتیوں کو دیکھ کر ہسپانیہ کی دختر نے کہا تھا: آصف! ان بتیوں کا اپنا تو کوئی
وجود نہیں۔۔۔۔۔ نہیں ہے ناں۔،، کن بتیوں کا آندا۔،، جو بتیاں آپی آپ نیل کے سینے سے آلگی ہیں۔ میلوں کا فاصلہ طے کر کے۔

اس افسانے پلاٹ میں تصادم اور کشمکش اہم جز کی حیثیت سے ساتھ ساتھ موجود ہیں جس سے تضادات کی بنیاد ان کے اندر ہی پیدا ہونے والے ناخوشگوار واقعات کا سلسلہ ہے۔ لہذا تصادم زری اور آصف کی ذات میں جاری رہتا ہے۔ جس کو افسانہ نگار کہانی کے آخر تک مہارت سے لے چلی ہیں۔ اور یہ تصادم اس وقت اپنی کی انتہا کو پہنچتا ہے جب مہ رخ آصف سے شادی کی پیشکش ٹھکرا دیتی ہے اور ادھر ملاقات نہ ہونے اور آصف کی محبت نہ مل سکنے کی صورتحال میں زری کی اپنے شکاری باپ کی بندوق سے خودکشی اور بے بسی میں تڑپتے ہوئے جان دے دینا۔ اور زری کی ناگہانی موت کی خبر پر آصف کا دکھ سے بوجھل رویہ اس پر زری کی محبت کے اعتراف کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے پلاٹ میں کلائمکس زری کی موت ہے اس کہانی کا مبہم انجام ابتدا میں ہی زری کے ساتھ خیالی مکالمے میں پیش کر دیا گیا ہے۔ جس میں آغاز میں بتا دیا جاتا ہے آصف،، زری نامی کم سن لڑکی کی ناآسودہ محبت کو ہائی سنتھ کے پھول سے مماثل قرار دیتا ہے جو محبت کے مدفن پر کھلتے ہیں۔ اس افسانے انجام بھی دائروی ہے کیونکہ مرکزی کردار کی کہانی ابتدا میں جس تاسف اور کشمکش کی علامت تھی انجام میں بھی ویسے ہی ہے۔

بانو قدسیہ کے افسانہ ،، شطرنج کی چال ،، میں بلیک بورڈ پر لکھی ہوئی ،، بائی نو میل تھیورم ،، سے یہ سوال ابھرتا ہے کہ ،، انسان کتنا خود مختار اور کتنا مضبور محض ہے ،، ؟ اس کے اپنے ارادے اس کے نتائج اور ارادے سے کس طرح آزاد ہیں ؟ انہوں نے اس سوال سے کہانی کا پلاٹ ترتیب دیا ہے جو مرکزی کردار ،، گل جان ،، نے حل کرنے کی اپنی سی کوشش کی اور یہ نتیجہ اخذ کیا:

،، اللہ نے ہر چیز جوڑا جوڑا پیدا کی ہے ۔۔۔ ایسے ہی انسان کی خود مختاری

اور اس کی قسمت زوج ہیں ۔ جو ساتھ ساتھ ریل کی پٹڑی کی طرح چلتی ہیں جہاں

دونوں کا میل ہوتا ہے ۔ وہاں کرنٹ پیدا ہوتے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔ ترقی کا بقعۂ نور ۔۔۔۔ بربادی

کا گھپ اندھیرا ۔۔۔۔ سب ان دونوں کے ملاپ سے ہیں ۔ ،، 25

یہ مابعد العقل اور مابعد الطبعیات کا نتیجہ ہے ۔ ،، مگر یہاں بانو قدسیہ نے کہانی کے پلاٹ میں فنکارانہ خردمندی سے اس دور کی حقیقت کو آشکار کر دیا ہے ۔ ایسی ہی کہانی ،، ان کے افسانہ ایک ، دو اور تیسرا وہ ،، جو حقیقت کی تلاش کا سفر سوالات کی کرید سے معنی کی پرتیں کھولنے کا باعث ہے ۔ ان میں وہ حقیقتیں زیادہ اہم بن جاتی ہیں جو زندگی کی کسی ان دیکھی سمت سے نمایاں نظر آتی ہیں ۔ اور انسانی فکر کی کایا یک دم پلٹ جاتی ہے ۔ ایسی ہی واردات قلبی کا سامنا عبدالکریم دودھ فروش کے بیٹے کو بھی ہوتا ہے جو اس کی بیوی کے پہلے شوہر کی اولاد تھا ۔ سرمد ،، دینی لگن رکھنے والا درویش صفت انسان تھا تبلیغی جماعت کے اجتماع میں شریک ہو کر دعا مُن ضرور شریک ہو جاتا ۔ کہانی کا اغاز ایک ایسے وسیع و بلیغ نظریے کی بنیاد پر استوار ہے جس سے کائناتی سطح پر مضمر راز منکشف ہوتے ہیں اور انسان عقل سے ماورا تصور خودی کی گہرائیوں کا سفیر بن جاتا ہے بانو قدسیہ نے انسانی معراج کے نئے جہانوں سے قاری کو نہ صرف متعارف کروایا ہے بلکہ اسے دنیا کی تخلیق کے مقصد و معانی سے روشناس کرواتی ہیں ۔ اسی ربط و تسلسل کو کہانی کے ساتھ آگے لے کر چلتی ہیں ۔ منطقی دلائل کا نظام وضع کرنا جدید افسانے کی بڑی خوبی ہے جسے افسانہ نگار نے کہانی میں مد نظر رکھا ہے ۔ سوالات کی کرید کچھ یوں بھی تھی جب سرمد خود اس سوال کے روبرو تھا:

،، میں نمازیں چھوڑ کر سارا دن دنیاداری کروں ؟ پیسہ کماوں اور اللہ کو بھول جاوں ؟

اس افسانے میں درحقیقت حقوق اللہ اور حقوق العباد کا تعین کرنے کی بہترین کوشش کی گئی ہے ۔ جو زندگی زندگی کی واقعاتی حقیقت کے ساتھ منسلک ہیں ۔ جیسے ہی افسانے کے اختتام کی واقعات کا ربط بڑھتا ہے جہاں عورت اور مرد کے منکوحہ کھیل میں ایک اور کردار وہ تیسرا (بچہ) ہے شامل ہوتا ہے اور یہی تیسرا اس کھیل پر بھی اور کہانی کے اصل راز پر قابض ہو جاتا ہے ، اور اس کے فکری اور ذہنی اتھل پتھل سے افسانہ نیا موڑ لیتا ہے ۔ اور بالآخر سے راز فاش ہوتا ہے کہ یہ تیسرا تو ایک پانسہ تھا ۔ کبھی آئے تو صرف چھکا اور کبھی اپنے سے آگے کوئی گوٹ نکلنے ہی نہ دے ۔ پلاٹ میں ردھم اور واقعاتی ترتیب ایک اہم مقام ہے جہاں زندگی کا گہرا معمہ کھلنے ہی میں نہیں آتا ۔ اور کہانی بظاہر ایک گورکھ دھندہ اور سوال کا گجلک کھیل بن جاتی ہے ۔ اور قاری افسانہ نگار کے

ہمراہ کہانی کی انگلی تھامے نئی سوچوں کا مسافر ہو جاتا ہے۔افسانے میں مرکزی کردار سرمد،، کی سوچ کی عملی شکل کہانی کا نقطہ عروج ہے یہاں پہنچ کر اس کی زندگی تمام واقعات ایک نتیجہ خیز سوالات کا نظام کھڑا کرتے ہیں جو قاری کہانی کر متیعن مرکز تک پہنچنے میں راہ نمائی کا باعث بھی ہیں۔

افسانہ،،مات،، میں کہانی کی حقیقت واقعات کی ترتیب میں بانو قدسیہ اپنے غیر روایتی انداز میں پیش کرتی ہیں۔اور پھر اپنے بیانیے میں کہانی کا فطری اسرار مبہم انداز میں کھولتی ہیں۔اس خوبی بیان کو ہمراہ لے کر چلتی ہیں کہ ان کے ہر افسانے کا پلاٹ تنوع کا نیا سرا تھام لیتا ہے۔اور قاری کو اپنے ساتھ ساتھ لے کر چلنے قائل کرتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ ایک مضبوط پلاٹ کی زمینی و زمانی حقائق کی توجیح ہوتی ہے کہ کہانی میں تکنیک اپنے تمام لوازمات کو کہانی کے موضوع اسلوب بیان کے ساتھ ربط سے پیش کرے اور بانو قدسیہ کی کوشش نمایاں نظر آتی ہے جو ان کے قاری جوڑے رکھتی ہے کہانی سے اس کے ظاہری اور باطنی الجھاو سے دور نہیں کرتی چاہے موضوع کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔اس افسانے کے چند آغازیے درج ذیل ہیں:

افسانہ مات،، میں اس کا اغاز ذرا ڈرامائی انداز لئے ہوئے ہے۔

،،نہ جانے یہ چھرا کیسے چلا؟،، یہ سادہ سا جملہ آنٹی شائستہ کے تاثر سے مزید پر اسرار ہو جاتا ہے:،،آنٹی کو لگتا تھا کہ آج جتنی خبریں اخباروں میں چھپیں اور آئندہ بھی چھپتی رہیں گی،وہ سب کی سب اس خبر کے سامنے بیکار ہیں،نہ تو یہ خبر پولیٹکل تھی نہ، کسی ملک نے دوسرے ملک کے اندورنی معاملات میں دخل اندازی کر دی تھی، مرگ ناگہانی، حادثہ،ڈکیتی یا اغوا کا معاملہ بھی نہ تھا،کھیلوں سے بھی اس خبر کا تعلق نہ تھا۔یہ خبر تو گھروں کے اشتہار،ٹینڈروں کے نوٹس،نوکریوں کی اطلاع اور فلموں کے سکینڈل سے بھی معمولی تھی،، لیکن اس خبر سے لپٹ کر آنٹی کا دل چپو ہو گیا تھا۔،،26

دل کا چپو ہو جانا ایک حقیقی سانحہ ہی ہے، جس کا تجسس جاننے کے لیے قاری مکمل افسانے کی معانی اور مفاہیم کو کھولتا ہے۔اسی دوران اسے کہانی کے پلاٹ کے مختلف مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔اور کہانی موجود افتراقات اور اتار چڑھاو سے مانوس ہوتا ہے۔ جس طرح اس افسانے میں آنٹی شائستہ سے پہلے تعارف میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے احساس کے مطابق گوبی کے پتوں کا بڑا ڈھیر ہے جو سبزی منڈی کے باہر فالتو پڑا گلتا سڑتا رہتا ہے۔اور جسے سیر چشم گائے، بھینس بھی نہیں کھاتیں، لیکن جگت آنٹی شائستہ پر وہ دور بھی گذرا تھا، جن دنوں وہ پلکیں اٹھانے جھکانے میں ہی بھونچال کا باعث بن سکتی تھی۔دو جوان لڑکیوں کی ماں ہونے کے باوجود بالکل جوان لگتی تھی۔اسی طرح اپنے شوہر لطیف سے دو قدم پر وہ ان سے بہت کم عمر لگتی تھیں۔وہ اپنے دل میں گوندنی کی طرح کا زیور لد کر تخت پوش پر بیٹھی رہے اور تمام کم تر ایرے غیرے ان کے گرد مور چھل جھلتے رہیں۔اور ایک وقت کے بعد شائستہ کی خود اعتمادی کو گہری چوٹ لگتی ہے۔تو اسے آئینے کے سامنے اپنے حسن کے زوال پر شک گذرتا ہے۔کہ اس کی پنڈلیاں،بھاری اور کمر اب سڈول نہیں رہے وہ

ایک دلربا امراو جان ادا کے بجائے ایک میراثن بھانی کی طرح سب کی کھائی کھیلی نظر آتی ہے۔ کہانی کے پلاٹ میں واقعات کے اس مدو جزر میں افسانہ اپنے اختتام کو پہنچتا ہے اس کے ساتھ نئی حیرت نمایاں ہو جاتی ہے۔یوں وقت گذرتے ہی جس نے کبھی کسی سے مات نہیں کھائی تھی اپنی بہوؤں انیلا اور روزی کے سامنے ہتھیار ڈال کر تسبیح سنبھال لیتی ہے۔ جس پر اس کے آنسو گرتے ہیں، زندگی کے اس موڑ پر پچپن برس میں وہ مقام حاصل کر لیا جہاں وہ اپنی بہوؤں سے مات نہیں کھا سکتی، افسانے کے آغاز میں قارئین کو دعوت مطالعہ ایک موئثر سادہ جملے سے ملتی ہے، مگر اختتام ایک نہایت خوشگوار حقیقت پر منتج ہوتا ہے۔اور خوبی یہ ہے کہ چند صفحات میں مصنفہ زندگی کی بے شمار تلخ حقائق منکشف کرتی ہیں۔اس طرح مطالعے کے دوران ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مخاطب سامنے موجود ہے اور راوی اس سے محو گفتگو ہے۔ لیکن حقیقی معنوں میں راوی گذشتہ یادوں کو اس طرح دہراتا ہے کہ وقعات کی پیش کش میں براہ راست ہم آہنگی کا گمان ہوتا ہے جیسے کہ مرکزی کردار شائستہ آنٹی کے حوالے بہت نمایاں ہے۔

بانو قدسیہ کے کچھ افسانوں میں،، موم کا پتلا،،،، ذات کا محاسبہ،، سامان شیون،، ہونقش اگر باطل سوغات،،،، ڈاھڈے سنگ پریت،، اور دیگر میں کردار اور متن حقیقی معنوں میں پلاٹ کی اندورنی کیفیات اور کہانی کی اصل فطرت کو ظاہر کرتے ہیں۔یعنی ان کے اذہان ایسی تصویریں دیکھتے ہیں، جس کے وہ خواہشمند ہیں لیکن جو حقیقت میں انہیں میسر نہیں بلکہ ایک طرح کی فینٹسی اور خواب کے سحر میں مبتلا ہوں۔اس طرح کہانی ایک کردار کے ذہن میں رواں تصورات کی ہی عکاسی نہیں کرتی بلکہ اس کے ہر خیال کے ساتھ ایک منظر تخلیق ہوتا ہوا نظر آتا ہے اور اس کا ہر تصور اس کی باطنی کیفیت کا ضامن بن جاتا ہے۔ بانو قدسیہ کے افسانوں کے پلاٹ کے جائزے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ ادب کی قابل باشعور مصنفہ ہی نہیں بلکہ حساس ذہن و فکر والی تخلینق کار بھی ہیں۔زندگی کی سچائی کو واقعات کی ترتیب میں سموا پنے افسانوں کا پلاٹ مرتب کرتی ہیں۔اصول وضوابطکے ساتھ کہانی کے نئے امکانات اور تجربات کے اظہار پر بھی مضبوط گرفت رکھتی ہیں۔ان کی کہانیوں منطقی ربط، استدالی رویہ، تسلسل بھرپور انداز سے ابھرتا ہے۔اور اکثر یہ تسلسل کرداروں کی یادوں اور داخلی فکر سے بھی قائم ہوتا ہے۔ بانو قدسیہ کہانی کے اظہار میں قاری کے قلب وذہن کو مہارت سے ملوث کرتی ہیں۔

حوالہ جات

انوار احمد، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۲۰۱۲ ص752

ایضاص۱۷

ایضا، ص۶

وقار عظیم سید، داستان سے افسانے تک، اعتقاد پبلیشنگ ہاوس نیو دہلی ۱۹۶۰ص۸

بانو قدسیہ، آتش زیر پا، سنگ میل پبلکیشنز لاہور، ص۲۳

ایضا، ص۳۴

انور سدید ڈاکٹر، بانو قدسیہ شخصیت و فن، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد اکادمی ادبیات پاکستان ۲۰۰۸، ص۳

بانو قدسیہ، مجموعہ کچھ اور نہیں، سنگ میل پبلیکشنز لاہور ۲۰۰۱، ص ۶۵

ایضا، ص ۶۷، ۷۲، ۸۰

انوار احمد ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۱۰، ص ۴۷۲

بانو قدسیہ، امر بیل، موج محیط آب، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۹۹، ص ۱۲۷

ایضا، ص ۱۲۹

ایضا، ص ۱۳۴

ایضا، ص ۶

بانو قدسیہ، امر بیل، ہو نقش اگر باطل، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور، ۱۹۹۹، ص ۹۔۲۱

ایضا، ص 22

انوار احمد ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۱۰۔، ص ۱۳

بانو قدسیہ، آتش زیر پا، مات، سنگ میل پبلیکشنز لاہور، ۱۹۸۸، ص 77

۔Novelist on the novel by Mairiam Allott . p. 2491۔

مرزا حامد بیگ، اردو افسانہ نگاری کی روایت، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد ۱۹۹۰۔۱۹۰۳، ص ۲۰

بانو قدسیہ، آتش زیر پا، واماندگی شوق، سنگ میل پبلیکشنز لاہور، ۱۹۸۸، ص ۱۲۷

ایضا، ۱۳۰

بانو قدسیہ، کچھ اور نہیں، کلوسنگ میل پبیلکیشنز لاہور، ۲۰۰۱، ص ۴۰، ۳۹۔

انوار احمد ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، قتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۱۰، ص

بانو قدسیہ، سامان وجود، سنگ میل پبلیکشنز لاہور، ۱۹۹۹ص ۱۹۶۔۱۹۸

بانو قدسیہ، آتش زیر پا، سنگ میل پبلیکشنز لاہور، ۱۹۸۸ص ۱۵۱۔۱۵۱